افسانہ جلاوطن ایک تجزیاتی مطالعہ

(مسرور جہاں)

Afsana Jila Vatan Ek tajziyati Mutala
(Writer Masroor Jahan)
Dr Azhar Abrar department Urdu
Mail. azhar_ abrar@ rediffmail.com.
Mobile number. 9970 284 175

مسرور جہاں دنیائے اردو ادب میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جن کے قلم میں لکھنو کی دھڑکن سنائی دیتیں۔ یہاں کی تہذیب و معاشرت کا جس باریک بینی سے انہوں نے معائنہ کیا اور جو کردار پیش کیے وہ انہی کا خاصہ تھا۔ وہ خود بھی اپنی زندگی میں ملنسار، باکردار اور مہذب خاتون تھیں، ان کا سلوک سبھی سے اسی قدر مربیانہ رہا کرتا تھا کہ جو ایک بار ان سے ملاقات کر لیتا پھر ان کی شخصیت اور بات چیت کے لہجے کو کبھی نہیں بھول پاتا۔ وہ جس طرح اپنی عملی زندگی میں اپنے آس پاس کے ماحول کو محسوس کرتیں اور پھر ان چلتے پھرتے کرداروں کو یوں پیش کر دیتی جیسے کسی نے ان واقعات کو لفظوں میں قید کر لیا ہو۔ .

مسرور جہاں نے لکھنے کا آغاز 1950 51 سے کیا۔ 54 55, کے بعد ان کی متواتر تخلیقات منظر عام پر آنے لگیں۔ آپ کی پہلی کہانی" وہ کون تھی" اخبار قومی آواز میں شائع ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب گھر کی چار دیواری ہی لڑکیوں کی حد ہوا کرتی تھی۔ پردہ کا مکمل لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اور پھر لڑکیوں کا نصابی کتابوں کے علاوہ کوئی رسالہ پڑھنا معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں مسرور جہاں نے اپنے اندر کے فنکار کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ چوری چھپے ناول اور کہانیاں پڑھتی رہیں اسی طرح لکھنا بھی جاری رکھا کبھی اپنا قلمی نہ نام لتا پروین رکھا تو کبھی ناز روحی یا مسرور خیال رکھا ۔ لیکن شادی کے بعد جب ایک پبلشر نے انکےنام مسرور خیال کی جانب توجہ مبذول کروائی کہ آپ کے ناول خواتین پسند کرتی ہیں اور یہ نا مرد کا سا ہے۔ آخر انہوں نے اپنا نام مسرور جہاں بتایا بعد میں تمام تخلیقات اسی نام سے شائع ہوئیں۔ اس زمانے میں جو کہانی کار لکھ رہے تھے ان میں عصمت چغتائی، اے ۔آر خاتون رضیہ بھٹ اور صالحہ عابد حسین شامل تھیں مسرور جہاں نے ان تمام کو پڑھتی تھیں اور متاثر بھی ضرور ہوئیں لیکن اپنی راہ خود بنائی۔ ان کا اپنا منفرد لب و لہجہ اسلوب نگارش ان کی تحریروں کی پہچان بن گیا ہے - .

مسرور جہاں نے اپنی کہانیوں میں عورتوں پر ہورہے تشدد کے واقعات معصوم بچوں کے ساتھ کی جانے والی نا انصافیوں اور اپنا وطن عزیز کو چھوڑ کر دیار غیر میں روزی روٹی کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانے والوں کے مسائل پر بھی قلم اٹھایا - .

جلاوطن مسرور جہاں کا منفرد افسانہ ہے جو حاضر متکلم کے صیغے میں لکھا گیا ہے۔ پورے افسانے میں قاری کو متعدد بار یہ احساس جاگزیں ہوتا چلا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں

کی اپنے وطن سے محرومی کس قدر انہیں اندر تک کھوکھلا بنا دیتی ہے۔ ان اجنبی زمینوں پر انسان کی شناخت کھو کر رہ جاتی ہے۔ ایسا شخص صرف پیسہ کمانے کی مشین بن جاتا ہے جس کے دل سے احساس محبت اپنائیت اور وہ لطیف جذبے نکلتے چلے جاتے ہیں۔ جو کبھی اس کی طبیعت کا خاصہ ہوا کرتے تھے .

افسانے کی ابتدائی سطور میں اس شخص کی غریبی میں بسر ہو رہی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب وہ ایک کمپنی میں فورمین ہوا کرتا تھا اس وقت وہ کس قدر خوش وخرم تھا۔ گھر کے افراد کو یہ پرواہ بھی نہیں رہتی تھی کہ گھر میں کسی قیمتی سامان کی ضرورت بھی ہے۔ بس روکھی سوکھی کھا کر وہ سب اپنے شب و روز کے دائروں کو مکمل کیا کرتے تھے۔ لیکن جب پڑوس کے اجمل صاحب جو اپنے وطن کو چھوڑ کر باہر ملکوں میں نوکری کرنے کے لئے نکل پڑے اور وہاں سے ڈھیر سارے روپیوں کی بارش ہونے لگی تو ان کے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا اس وقت فورمین کی ہنستی کھیلتی زندگی

میں جیسے زلزلہ آ گیا اور مٹی سے بنے اس جھوٹے سے گھر کی بنیادیں ہلنے لگیں پھر گھر میں موجود ماں ،بہن ،بھائی بیوی ،سب تقاضہ کرنے لگے کہ وہ بھی باہر جائے روپیہ کمائے۔ اتنی کم تنخواہ میں گزارا نہیں ہو پاتا۔ اس شخص کو بڑا تعجب ہوا کہ ابھی تک جس گھر پر اسے ناز تھا جہاں ایک کمزور چھت کے نیچے وہ سب مضبوط رشتوں کی ڈور میں بنے

ہوئے تھے کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی اور سب ایک دوسرے کا کس قدر خیال رکھتے تھے اب اچانک کیا ہوا کہ اس مٹی کے گھر کی دیواروں میں شگافیں پڑ گئیں اور اسے جو اپنوں پر فخر تھا اب ان کی زبانیں گلے شکوے میں ڈوبی ہوئی رہنے لگیں ۔

یہاں افسانہ نگار نے ملک سے جانے والوں پر گہرا طنز کیا ہے کہ وہ اپنی زمین کو چھوڑ کر ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہیں ۔ اور نئی زمینوں پر جاکر جلاوطن ہو جاتے ہیں پھر وہ واپس آنا بھی چاہیں تو نہیں سکتے ، وہ اپنی زندگی میں گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ جس میں رشتے خود غرضی کی بھینٹ چڑھا جاتے ہیں۔ لیکن یہ افسانہ اس شخص کی داستان غم بیان کرتا ہے جو اپنے وجود میں اپنے وطن اور اہل وطن کے لیے مقناطیسی قوت رکھتا ہے، کئی برسوں بعد بھی اس غیر آشنا ماحول میں اسے اپنوں کی یاد برابر ستاتی ہے ۔ وہ اپنی بستی کے ان غیر اجنبی چہروں کو بھی نہیں بھول پاتا جن سے اس کا بظاہر کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے" تین سال قبل جب میں اپنا وطن چھوڑ کر عرب کے ریگستان میں دولت کمانے آیا تھا تو میرے دل میں امنگ تھی ۔ حوصلہ تھا اور نئی منزلوں کی تلاش کی جستجو تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا سارا جوش اور ولولہ سرد پڑتا گیا۔ سارے دن کی کڑی محنت کے بعد جب میں اپنے ٹھکانے پر واپس آیا کرتا تو مجھے اپنے گھر کی یاد بری طرح تڑپاتی تھی۔ اپنے شہر کی تنگ گلیاں، کشادہ سڑکیں اور ہرے بھرے وسیع میدان کی یاد آتی گھر کے باہر لگا ہوا نیم کا چھت نار پیڑ جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھیل کود کر میں جوان ہوا تھا۔ اور اب میرے بچے اس کی گھنی چھاؤں میں مختلف کھیل کھیلتے تھے۔

رحمت دا کی دکان ، کلو کا چائے خانہ، جن سے بظاہر میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اب ان سب کی یاد میرے دل میں چٹکیاں لیتی اور بیوی بچوں کی یاد اور ان کی جدائی مجھے خون کے آنسو رلاتی اور میرا جی چاہتا تھا کہ ساری دولت پر لات مار کر اپنے وطن واپس چلا جاؤں، لیکن میں یہ سب صرف سوچ کر رہ جاتا،،

اب عرب کا ریگستان ہی اس شخص کی تقدیر بن گیا تھا۔ ایک دفعہ وہ بہت پریشانی کی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ جس وقت اس کمپنی کا معاہدہ ختم ہونے کی
معیاد پوری ہونے کے قریب ہوتی ہے اور اس کی بیوی کو تشویش لاحق ہو جاتی ہے کہ یہاں آنے کے بعد وہ پوری طرح بے کار ہو جائے گا اور اتنی رقم بھی نہیں مل پائے گی جو ابھی تک ملا کرتی تھی ۔ ان سطور میں افسانہ نگار نے اس شخص کی حالت بتائی ہے کہ جب گھر سے رخصت ہوا تھا تو اس کی بیوی کی آنکھیں نم تھیں دل میں محبت بھری ہوئی تھی اور جدائی کا احساس رہ رہ کر اسے بے چین کئے دیتا تھا لیکن اتنے برسوں بعد اب جب وہ یاد کرتا ہے تو اسے افسوس ہوتا ہے کہ ابھی تک اس نے اپنے گھر والوں کے آرام و آسائش میں کوئی کمی نہیں کی اس کا گھر پہلے کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا۔ اب سیمنٹ کنکریٹ کی دو منزلہ عمارت ہے۔ گھر میں ٹوٹے پھوٹے اور بوسیدہ سازوسامان کی جگہ قیمتی سامان نے لے لی ہے۔ اس کی بیوی اب ایک امپورٹڈ کار چاہتی ہے۔ اس کے باوجود گھر میں اب اس کی یاد محض اس وقت ہوتی ہے جب گھر ڈرافٹ پہنچتا ہے۔ جب بھی گھر سے خطوط آتے ہیں ان میں سوائے فرمائشوں کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی نظریں خط کی ہر ہر سطر پر اس طرح ٹوٹ پڑتی ہیں جیسے کوئی پیاسا سمندر دیکھ کر بے قرار ہو جائے۔ کہ شاید کسی نے کوئی محبت بھرا لفظ اس کے پیاسے دل کو تسکین پہنچائے۔ لیکن ہر ہر لفظ کوئی نہ کوئی فرمائش اس لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہی اس کے دوست احباب اس پر رشک کرتے ہیں کہ اس کے اہل خانہ اسے بے حد چاہتے ہیں۔ لیکن یہ اس کا دل ہی جانتا ہے کہ اس کے گھر والوں نے ان سطور میں آرزو اور خواہشوں کے جو پہاڑ بنا دئے ہیں وہ صرف پیسوں سے ہی پگھل سکتے ہیں ۔

افسانے میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب اس کی ماں کا انتقال ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنی بہنوں بھائیوں اور بیوی کی فرمائش سے بدظن ہوکر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ گھر نہیں جائے گا، اب اس کے سر میں آئے ہوئے سفید بالوں کی تعداد بڑھنے لگی ہے۔ جو کئی سالوں کی داستان سناتے ہیں۔ جب وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں نوکریوں کی تلاش میں پھرا کرتا تھا۔ اس نے اپنے گلے میں جلاوطنی کا طوق ڈالنا قبول کیا۔ محض اس لیے کہ وہ جس محبت کا متلاشی ہوا کرتا تھا اسے وہ نہیں ملی۔ اب اس کا دل ایسا بت کدہ بن گیا ہے جس میں رکھے موم جیسے جذبات پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک احساسات اور اس کے اپنوں کی محبت جس سے وہ اپنی کل کائنات سمجھتا تھا سب ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اب اس دل میں سوائے پتھروں کے کچھ نہیں جو بے حس و جان ہیں۔ دراصل یہ شخص ان تمام لوگوں کی نمائندگی کررہا ہے جو جلاوطن ہیں۔ اور اپنے گھر والوں کے عیش و آرام کی خاطر اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں کہ پھر برسہا برس ان کی صورت نہیں دیکھ پاتے۔

افسانے میں وہ موڑ بہت درد ناک صورت اختیار کر لیتا ہے جب

اس شخص کو باہر رہتے ہوئے بیس برس کا عرصہ گزر جاتا ہے اور وہ اپنے بچوں کے بچپن کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے" میرے بچے شابی اور ٹوٹو جوان ہو گئے۔ ٹوٹوکا انجینئرنگ کا یہ آخری سال ہے۔ شابی بھی اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہے۔ اور ابھی کل ہی اس کا خط آیا ہے کہ اس نے شابی کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ مجھے اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنا چاہیے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میں گھر گیا بھی تو میری شابی مجھے کہاں ملے گی؟ وہ چار سال کی گول مٹول بچی جسے میں اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ کہیں ماضی میں گم ہو چکی ہے۔ اب جو شا بی ہے نہ وہ مجھے پہچانتی ہے اور نا میں اسے"۔ اس کی بچی اب شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے۔ اور بیٹے کا انجینئرنگ میں آخری سال ہے۔ لیکن اب اس جلاوطن کے وہ لطیف جذبات و احساسات جو کبھی گھر والوں کےلئے ہوا کرتے تھے ان کی جگہ اس کے جسم میں ایک مسلسل مشینی صورت اختیار کر لی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ان لوگوں کو میری ضرورت نہیں تو میں کیوں ان کا خیال رکھوں۔ وہ صرف روپیہ چاہتے ہیں۔
-

آخر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ جب وہ ان لوگوں کو صرف پیسے کی ضرورت ہے تو میں پیسہ ہی بھیجتا رہوں گا اور

پھر جب مرنا ہی ہے تو اپنی زمین ہو کیا ضروری ہے ساری زمینی اب میری ہے اپنے وطن میں مرو ں یا اجنبی زمین پر

ہماری زندگی کا مقصد تو پیسہ کمانا ہے۔ میری طرح سیکڑوں اور ہزاروں لوگ اپنا گھر اور اپنا وطن چھوڑ کر اجنبی زمینوں " پر محض پیسہ کمانے جاتے ہیں ۔ اور نا چاہتے ہوئے بھی اس جنگ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جنگ کے خطرے کے پیش نظر بہتوں نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں یہیں رہوں گا۔ اگر جانا بھی چاہوں تو کہاں جاؤ؟ اس وسیع دنیاکے کسی بھی خطے

سے زمین پر مرنے سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" پھر وقت ایسا بھی آتا ہے جب اس ملک میں جنگ کے بادل منڈلاتے ہیں۔ اور ہوائی جہازوں کے شور سے آسمان بج اٹھتا ہے۔ لیکن وہ کہیں جانا پسند نہیں کرتا اور کہتا ہے جب مرنا ہی ہے تو موت کہیں بھی آسکتی ہے -
-

مسرور جہاں ناول افسانے میں بڑی چابکدستی سے اس جلاوطن شخص کے جذبات کا اظہار کیا ہے جو اس ذہن و دل میں چل رہے تھے۔ جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی زمینوں کو چھوڑ کر باعث مجبوری یا پھر اپنے شوق کی خاطر اپنوں سے کٹ کر دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں گویا وہ اپنی شناخت کھو دیتے ہیں۔ اور مشینوں کے درمیان ڈبل شفٹ میں کام کرتے رہنے سے اس قدر بے حس و بے مرّوت بن جاتے ہیں کہ رشتوں کا تقدس پامال ہو جاتا ہے۔ جس کی اہم وجہ گھر والوں کی وہ لالچ ہوتی ہے جو انہیں مجبور مزید پیسہ کمانے کے لئے اس آتی رہتی ہے۔ اس افسانے میں بھی یہ شخص گویا اپنے آپ کو کم آمدنی کی وجہ سے اس سزا کا مستحق سمجھتا ہے۔ جب اس کے گھر والے اسے ناکام اور سست و کاہل جیسے القاب سے نوازتے ہیں۔ آخر وہ کیوں نہیں اجمل صاحب کی طرح پیسہ کماتا ہے
-